

ہم نے کشمیر کیسے کھویا۔!

علامہ محمد اسد

محمد اسد اُمت مسلمہ کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی جس نے علمی اور فکری میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور پاکستان کے قیام اور تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس جرمین نو مسلم نے جب اسلام کے دائرے میں قدم رکھا تو پھر اس کی زندگی کا مقصد اسلام اور اُمت مسلمہ کی خدمت ہو گیا۔ قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھا اور تقسیم ملک کے بعد اس نے بھی دوسرے لٹے پٹے مہاجرین کی طرح اپنے خوابوں کی سرزمین کی طرف مراجعت کی۔ پاکستان ایک حقیقی اسلامی ریاست بنے، اس کے دل کی آرزو تھی۔ اس نے اس وقت کی حکومت پنجاب کے ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے پاکستان کی نظریاتی تعمیر کے لیے ایک روشن کردار ادا کیا، اور پھر سفارت کے محاذ پر پاکستان کی ترجمانی کرتا رہا۔ افسوس کہ بعد کی پاکستانی قیادت نے اسے مایوس کیا۔

محمد اسد کی خودنوشت داستان شمشاد مگہ فکر و دانش اور علم و ادب کا ایک شاہکار ہے۔ بد قسمتی سے اس کی دوسری جلد نامکمل رہی اور ان کے نوٹس کی مدد سے موصوف کی بیوہ نے مرتب کی ہے، جو انگریزی سے بھی پہلے اردو میں جناب محمد اکرام چغتائی کی محنت سے بندہ صحرائی کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک حصہ ہم قارئین ترجمان القرآن کی نذر کر رہے ہیں۔ اس سے ایک طرف ان جذبات اور مقاصد کا صحیح ادراک کیا جاسکتا ہے جو قیام پاکستان کا اصل محرک تھے تو دوسری طرف قیادت کی نااہلی اور دشمنوں کی عیاری کی ایک کرب ناک داستان بھی سامنے آتی ہے۔ تیسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں نے بھارت کی غلامی کو کبھی بھی قبول نہیں کیا اور آج بھی وہ اس کے تسلط سے نجات پانے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کس طرح ۴۹-۱۹۴۸ء میں ہماری سیاسی قیادت نے دھوکا کھلایا اور جیتی ہوئی بازی ہار گئی اور کس طرح آج کے حکمران طبقے پھر انہی دشمن قوتوں کے چکھے میں آنے کے لیے بے تاب ہیں۔ خورشید احمد

اکتوبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو نواب افتخار حسین ممدوٹ نے مجھے اپنے دفتر بلا یا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ دراز قد، صحت مند، خاموش طبع اور صاف ستھرے ذہن کے مالک اور تقسیم ہند سے قبل وہ ایک چھوٹی سی ریاست یا بالفاظ دیگر جاگیر کے کرتا دھرتا تھے۔ یہ جاگیر سترھویں صدی عیسوی [ان کے آباؤ] میں ایک مغل حکمران نے دی تھی۔ نواب صاحب تحریک پاکستان کے اکابرین میں شامل رہے اور اپنی ذاتی دولت کا بڑا حصہ اس تحریک کی نذر کر دیا۔ یہ جاگیر مشرقی پنجاب میں واقع تھی، چنانچہ تقسیم کے وقت اسے ہندستان ہی میں چھوڑ آئے اور لاہور آ کر یہاں ایک متوسط درجے کے گھر میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی وفاداری اور راست بازی کے پیش نظر محمد علی جناح نے پاکستان کے قائم ہوتے ہی انہیں مغربی پنجاب کا پہلا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اس بنا پر انہیں قائد اعظم کے قریب ترین رفقا میں شمار کیا جانے لگا۔

جونہی میں ان کے دفتر میں داخل ہوا، ممدوٹ صاحب رسمی تکلفات کی پروا کیے بغیر کہنے لگے: ”اسد صاحب! میرے خیال میں اب ہمیں نظریاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام اٹھانے چاہئیں۔ آپ نے ان کے بارے میں تقریراً اور تحریراً بہت کچھ کیا۔ اب آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟ کیا ہمیں وزیر اعظم سے رجوع کرنا چاہیے؟“

کئی روز سے مجھے ایسے سوال کا انتظار تھا، چنانچہ میں نے پہلے ہی سے اس کا جواب سوچ رکھا تھا: ”ابھی مرکزی حکومت نے ان مسائل کا ذکر نہیں کیا، اس لیے نواب صاحب! آپ ہی اس ضمن میں پہل کیجیے۔ میری رائے میں آپ ہی کو پنجاب میں ایک ایسا خصوصی ادارہ قائم کرنا چاہیے، جو ان نظریاتی مسائل کو زیر بحث لاسکے، جن کی بنیاد پر پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ خدا نے چاہا تو آئندہ حکومت کراچی بھی اس اہم فریضے کی جانب متوجہ ہوگی۔ اس وقت وہ اپنی خارجہ پالیسی کو تشکیل دینے میں مصروف ہے۔ ان حالات میں شاید وزیر اعظم یا قائد اعظم ادھر زیادہ توجہ نہ دے سکیں۔“

نواب صاحب فوری قوت فیصلہ کی صلاحیت کے مالک تھے، چنانچہ انہوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا: ”آپ کے اس مجوزہ ادارے کا کیا نام ہونا چاہیے؟“

میں نے جواباً عرض کیا: ”اس کا نام ’محکمہ احیاء ملت اسلامیہ‘ مناسب رہے گا، کیونکہ اس سے ہمارے مقصد کی بھرپور ترجمانی ہوگی، یعنی صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی

اور فکر کی تعمیر نو۔“

مدوٹ صاحب نے بلا توقف کہا: ”بالکل درست، ایسا ہی ہوگا۔ آپ اس ادارے کے قیام کا منصوبہ اور اس کے اخراجات کا ایک تخمینہ تیار کیجیے۔ آپ کو سرکاری طور پر اس ادارے کا ناظم مقرر کیا جاتا ہے اور آپ کی ماہوار تنخواہ شعبہ اطلاعات کے ناظم جتنی ہوگی۔ مجھے امید ہے، آپ اسے قبول کر لیں گے۔“

مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی فیصلہ ہو جائے گا، لیکن نواب آف مدوٹ کے فیصلوں کا یہی انداز تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر اس ادارے کا رسمی میمورنڈم تیار ہو گیا۔ اس کے اخراجات کے تخمینے پر بحث ہوئی۔ شعبہ مالیات کے سربراہ کے صلاح مشورے سے یہ منظور ہو گیا، اور سرکاری اطلاع نامہ بھی جاری کر دیا گیا۔ یوں دیکھتے دیکھتے محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ پوری اسلامی دنیا میں یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلا ادارہ تھا۔

میں نے لاہور کے بعض معروف علمائے دین بالخصوص مولانا داؤد غزنوی امیر جماعت اہل حدیث سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایسے دو اصحاب کے نام بتائیں جو میرے تحت کام کر سکیں، عربی اچھی جانتے ہوں اور میری آئندہ کی تجاویز کو عملی شکل دینے میں جن ضروری حوالوں کی ضرورت پڑے، انھیں احادیث کے ضخیم مجموعوں میں سے تلاش کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ جلد ہی ایسے دو نوجوان اور باصلاحیت علما دستیاب ہو گئے اور انھیں یہ کام تفویض کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں مجھے پنجاب یونیورسٹی کے ایک پُر جوش طالب علم کی جزوقتی خدمات بھی حاصل ہو گئیں۔ دفتر کے دیگر انتظامی اور مالیاتی امور کو بحسن و خوبی نبھانے کے لیے مجھے اپنے قریبی دوست ممتاز حسن کا تعاون حاصل تھا، جو مغربی پنجاب کے شعبہ مالیات کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور بعد میں اس کے سربراہ مقرر ہو گئے۔

اب میں باقاعدہ طور پر سرکاری ملازم تھا، اس لیے مجھے دو روپہ درختوں کے ایک خوب صورت علاقے چمبہ ہاؤس میں بلا کر ایہ گھر بھی مل گیا (یہ لین مہاراجا آف چمبہ کے نام سے موسوم تھی۔ یہ ریاست کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع تھی اور تقسیم ہند سے پہلے مہاراجا کا یہاں محل تھا)۔ اس گھر کے ارد گرد چاروں طرف چھوٹا سا باغ تھا۔ یہ ایک تجارت پیشہ ہندو کی ملکیت تھا، جو

ہندستان نقل مکانی کر گیا تھا۔ ممکن ہے، وہاں اسے کسی ایسے مسلمان کا گھر مل گیا ہو، جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ گیا ہو۔ نظر بندی کیپ سے میری رہائی کے بعد میرا بیٹا طلال کیتھولک اسکول میں بطور اقامتی طالب علم زیر تعلیم تھا۔ یہ لاہور کا اعلیٰ ترین ادارہ تھا جس کو آر لائنڈ کے ڈومینیکن چلا رہے تھے۔ اب میں اپنی بیوی کے ساتھ لاہور ہی میں مستقلاً رہائش پذیر تھا، اس لیے طلال اس گھر میں منتقل ہو گیا اور یہیں سے ہر روز اسکول جانے لگا۔ اب میرے لیے یہ نئی صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی صبح کو میں دفتر جانے کے لیے بذریعہ کار گھر سے نکل رہا تھا (میں نے ایک متروکہ کار اپنے نام الاٹ کرائی تھی) کہ اپنے ہمسائے اور دوست سر سکندر حیات خاں کے بھتیجے سردار شوکت حیات خاں سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ اس وقت خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے بتایا: ”میں نے ابھی ریڈیو پر یہ خبر سنی ہے کہ گاندھی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ قاتل کوئی مسلمان نہیں ہے“۔ میں اس کی پریشانی میں برابر کا شریک تھا۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ اگر قتل کرنے والا مسلمان ہوتا، تو ہندستانی حکومت اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ کیا سلوک کرتی۔ بہر حال چند گھنٹوں بعد آل انڈیا ریڈیو نے واضح بیان جاری کر دیا کہ گاندھی کا قاتل راشٹریہ سبک سنگھ کا رکن ہے۔ یہ انھی متعصب ہندوؤں کی جماعت تھی، جس نے ڈلہوزی کے مسلمانوں کا قتل عام بھی کیا تھا۔

محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کا کام آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم زکوٰۃ اور عشر کے اہم موضوع پر پورے انہماک سے تحقیق کر رہے تھے، کیونکہ کسی بھی اسلامی مملکت میں شرعی اعتبار سے محصولات کی بنیاد انھی دو پر ہے۔ ابھی تلاش و تفحص کا یہ مرحلہ طے ہو رہا تھا کہ ممدوٹ صاحب نے دوبارہ اپنے دفتر بلا یا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ حسب معمول کسی تکلف کے بغیر گویا ہوئے: ”میں نے ابھی ابھی آپ کا مضمون ’اسلامی دستور سازی کی جانب‘ پڑھا ہے، جو عرفات کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ آپ انھی خطوط پر قدرے شرح و بسط کے ساتھ ایک میمورنڈم تیار کیجیے۔ میں اسے مغربی پنجاب کی حکومت کی جانب سے شائع کراؤں گا اور اس کو دیکھ کر ممکن ہے، مرکزی حکومت بھی اس جانب متوجہ ہو“۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں میرا یہی انگریزی مضمون مع اردو ترجمہ مغربی

پنجاب کی حکومت کی زیر نگرانی طبع ہوا۔ کچھ ہفتوں بعد وزیر اعظم کی جانب سے مجھے کراچی آنے کا پیغام موصول ہوا۔

لیاقت علی خاں سے یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ میں قیام پاکستان سے قبل ان سے گاہے گاہے ملتا رہتا تھا۔ ان سے جب بھی گفتگو کا موقع ملتا، وہ کھلے ذہن اور پوری توجہ سے میری باتیں سنتے اور ساتھ ساتھ متواتر سگریٹ نوشی کرتے رہتے (میں نے جب بھی انہیں دیکھا، انہوں نے اسٹیٹ ایکسپریس کے ۵۰ سگریٹوں کا پیکٹ ہاتھ میں پکڑا ہوتا یا ان کے میز پر پڑا رہتا)۔ اس ملاقات میں بھی وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگائے جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی سگریٹ پیش کیا، چائے منگوائی اور مجھے اسلامی دستور پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا مشورہ دیا۔ ہماری ابتدائی دو ملاقاتوں میں بھی وہ اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ”لیکن ہم اس موقع پر خود دستور سازی کا عمل شروع نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ کشمیر پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا ہے اور ہمارے پٹھان بھائیوں کی سری نگر پر قبضہ کرنے کی کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ فوجی اعتبار سے ہندوستان ہم سے بہت مضبوط ہے۔ ہم تو ابھی حکومتی مشینری کے گل پرزے درست کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے لیے وقت اور سعی پیہم کی ضرورت ہے۔ ہم ایک ساتھ سارے کام شروع نہیں کر سکتے۔ میں مانتا ہوں کہ دستور سازی کا عمل اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہے، لیکن اسے بھی فی الحال مؤخر کرنا پڑے گا۔“

میں وزیر اعظم کی اس گفتگو سے متاثر ہوا، کیونکہ انہوں نے بلا تکلف حکومت کو درپیش تمام مسائل کا کھل کر اظہار خیال کیا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرح وہ بھی پاکستان کے اسلامی تشخص کو اُجاگر کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، لیکن ابھی حالات حاضرہ کے دباؤ کے تحت ادھر توجہ دینے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے ان کے موقف سے اتفاق کیا اور رخصت ہوتے وقت انہوں نے مجھے کہا: ”فی الحال ہمیں خود کو اس مسئلے پر سوچ بچار کرتے رہنا چاہیے۔“

اس کے بعد کابینہ کے سیکرٹری چودھری محمد علی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ حکومت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ان میں سب سے بڑا مسئلہ معاشی استحکام کا ہے۔

انہوں نے بتایا: قائد اعظم نے امیر ترین مسلمان حکمران نظام حیدر آباد دکن سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان کو سونے چاندی کی شکل میں چند لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ اُدھار دیں اور انہیں اپنے نام پر ہی بنک میں جمع کرا دیں، تاکہ پاکستانی کرنسی کو تحفظ مل سکے۔ لیکن نظام دولت کے انبار کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں، اس لیے انہوں نے قائد اعظم کی درخواست کو رد کر دیا ہے۔ چند ماہ بعد ہی ہندوستان نے حیدر آباد ریاست کی خود مختار حیثیت ختم کر کے اسے اپنے ملک کا حصہ بنا لیا اور نظام کے سونے چاندی کے تمام ذخیرے بھی ہندوستانی حکومت کے تصرف میں چلے گئے۔ نظام کے ساتھ ساتھ خود ان کی آل اولاد اور پاکستان بھی ہمیشہ کے لیے ان خزانوں سے محروم ہو گئے۔

جب میں چودھری محمد علی سے گفتگو کر رہا تھا، معاً مجھے نظام کے ذاتی خزینوں کی یاد آگئی۔ ۱۹۳۹ء میں، میں دوسری بار حیدر آباد گیا تھا اور اس وقت ریاست کے وزیر مالیات نے مجھے اس خزانے کا صرف ایک حصہ دکھایا تھا۔ متعدد کمروں میں قطار اندر قطار صندوق رکھے تھے اور یہ سب سونے اور قیمتی پتھروں سے بھرے پڑے تھے۔ ہیرے جواہرات سے بھرے لوہے کے تھال فرش پر رکھے تھے۔ مال و دولت کا ایک ناقابل یقین اور مردہ ڈھیر، جو ایک فانی شخص کی مریدانہ اور عجیب و غریب حرص کا نمونہ تھا۔

لیاقت علی خاں نے اپنی گفتگو میں آزادی کشمیر کی جس جدوجہد کا ذکر کیا تھا، وہ ہمیشہ میری اور ہر پاکستانی کی سوچ پر غالب رہی ہے۔ اس کی جغرافیائی، نسلی اور مذہبی وضع قطع کے باعث اس حسین و جمیل سرزمین کو لازماً پاکستان کا حصہ بنانا تھا۔ یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ تمام بڑے دریا (سندھ، جہلم، چناب اور راوی) مغربی پنجاب کی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں اور یہاں کی معیشت کا انحصار مکمل طور پر انھی دریاؤں پر ہے۔ ہندوستانی حکومت اور مہاراجا کے مابین اقرار نامہ کی وجہ سے ریڈ کلف نے صریحاً دھوکے بازی سے مسلمانوں کی اکثریت کا ضلع گورداسپور ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ ریڈ کلف کی یہ نوازش، تقسیم ہند کے طے شدہ بنیادی اصول کی خلاف ورزی تھی اور اسے کوئی پاکستانی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس وقت پاکستان اپنی سربریدہ فوج کے سبب ہندوستان سے جنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، اس لیے قائد اعظم نے کسی فوجی مداخلت کے امکان کو بالکل رد کر دیا۔ حکومت پاکستان کی اس واضح پالیسی کے بعد صوبہ سرحد اور

افغانستان کے ملحقہ علاقوں کے پٹھانوں کے قبائل پاکستان کے نام پر کشمیر کو فتح کرنے چل پڑے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں محسود، وزیری اور آفریدی قبیلوں کے بڑے بڑے جتھوں نے کشمیر کی سرحد عبور کر کے بارہ مولا اور مظفر آباد پر بلا مقابلہ قبضہ کر لیا۔ سری نگر کے اردگرد جو فوج تعینات تھی، اس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ انھوں نے بھی بغاوت کر دی اور پٹھان بھائیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کو تیار ہو گئے۔ قبائلیوں کی پیش قدمی جاری تھی اور سری نگر تک پہنچنا انھیں آسان دکھائی دے رہا تھا، لیکن اس دوران میں ایک تکلیف دہ واقعہ روپڑیر ہو گیا۔ یہ قبائل اپنی صدیوں پرانی غارتگری کی جبلت پر قابو نہ پاسکے اور سری نگر کی جانب قدم بڑھانے کے بجائے انھوں نے مظفر آباد کے شہریوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ دو دن تک لوٹ مار کا یہ بازار گرم رہا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا، جسے ان قبائلیوں نے ضائع کر دیا۔ چنانچہ اس عرصے میں ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو کی ملی بھگت سے جواہی حملے کے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ نئی دہلی میں برطانوی فوج کے تعاون سے ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل فوجی دستوں کو جلدی جلدی منظم کیا گیا۔ انھیں ہتھیار فراہم کیے گئے اور ایک ہلکے توپ خانہ کا بھی انتظام کر دیا گیا، تاکہ وہ سری نگر پر قبضہ کر کے وہاں کے ہوائی اڈے کو بھی اپنے دائرہ اختیار میں لے آئیں۔ اس طرح فوجی اور غیر فوجی جہازوں کے ذریعے ہندوستانی فوج کی خاصی بڑی تعداد کو سری نگر پہنچا دیا گیا، جہاں سے وہ ریاست کشمیر کے دوسرے حصوں پر بھی اپنا تسلط جمالیں۔ آہستہ آہستہ پٹھانوں کو نکال باہر کیا گیا اور پھر ان کا جذبہ جہاد مدہم پڑتے پڑتے ختم ہو گیا۔

تاہم کشمیر کی جنگ ختم نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں نئے قبائلی مجاہد اور ناگزیر بطور پر پاکستانی فوج کے دستے بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ ہندوستان نے وادی کشمیر پر قبضہ جمائے رکھا اور سرحد کے ساتھ ساتھ ڈور تک پناہ گاہیں اور خندقیں بنالیں۔ آج تک ہندوستان کشمیر کے اس حصے پر قابض ہے، جو گلگت سے لداخ اور کارگل کے برفانی پہاڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔ بالآخر پاکستان مسئلہ کشمیر کو مجلس اقوام متحدہ میں لے گیا، جہاں استصواب رائے کی قرارداد منظور کی گئی، جو اس علاقے کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔ حکومت ہندوستان نے اس قرارداد کو بڑی بے دلی سے قبول کیا، کیونکہ

۱- یہاں مضمون نگار کو اشتباہ ہوا ہے، اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ بھارت لے کر گیا تھا۔ مدیر

یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ اس قرارداد پر عمل درآمد کا نتیجہ پاکستان کی فتح کی صورت میں نکلے گا۔ چنانچہ ہندستان حیلے بہانے سے بار بار اس مسئلے کو ملتوی کرتا رہا۔ اب یہی مسئلہ کشمیر، پاکستان اور ہندستان کے اچھے ہمسایہ ممالک جیسے تعلقات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے۔ دونوں ملکوں کے سپاہی خندقوں میں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں مون سون کی بارشیں رکتے ہی میں نے کشمیر محاذ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مغربی پنجاب کے فوجی افسران نے مجھے ایک جیپ اور دو سپاہی بطور محافظ مہیا کر دیے اور میں کوہ ہمالیہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مری کے بعد سڑک تنگ اور ڈھلوانی ہوتی گئی۔ کہیں کہیں اسے تھوڑا سا چوڑا کیا گیا تھا، تاہم وہاں سے مقابل سمتوں سے آنے والی دو گاڑیاں گزر سکیں۔ اس سڑک پر ہندستان کے جنگی جہاز چانک یلغار کرتے اور مشین گنوں سے گولیاں بھی برساتے چلے جاتے تھے، اس لیے ہم رات کو روشنی کے بغیر سفر کرتے تھے۔ ہماری رفتار سست تھی۔ پہاڑ اور ڈھلوان کے درمیان سرکتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی چند لچھات کے لیے جیپ کی بڑی تہیاں جلا لیتے تھے۔

ہم مظفر آباد کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے سورج طلوع ہونے سے پہلے بلند و بالا برف پوش چوٹیوں میں واقع پہلی فوجی چوکی تک پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم پیدل چلتے ہوئے فوج کے ایک سپاہی کی رہنمائی میں اونچی نیچی ڈھلوانوں سے گزرتے ہوئے خاصی بلندی پر آ گئے۔ یہاں ایک چرواہے کی پرانی سی جھونپڑی تھی، جو اب فوجیوں کو اسلحہ بھجوانے کے لیے بطور ڈاک چوکی استعمال کی جا رہی تھی اور محاذ پر لڑتے ہوئے جو فوجی زخمی ہو جاتے تھے، انہیں ابتدائی طبی امداد بھی یہیں فراہم کی جاتی تھی۔

یہ جھونپڑی پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اس کی چھت پتھر لے ٹکڑوں اور درختوں کی ٹہنیوں سے تیار کی گئی تھی اور یہ چٹان کی دو عمودی دیواروں کے درمیان شگاف میں واقع تھی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو یہ جھونپڑی سپاہیوں سے بھری پڑی تھی۔ کچھ ابھی اگلے محاذ کے مورچوں سے واپس آئے تھے اور کچھ وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ نچلی چھت کے وسط میں پیرانن کا ایک لیپ لٹک رہا تھا اور اس کی مدھم سی روشنی کئی چار پائیوں پر پڑ رہی تھی۔ چار پائی مخصوص پاکستانی بستر ہے،

جو کلڑی اور انتر چھال کی رسیوں سے بنایا جاتا ہے۔ ان چار پائیوں پر زخمی سپاہی آرام کر رہے تھے۔ کمپنی کا طبی عملہ یہاں ان کا عارضی علاج معالجہ کر رہا تھا اور یونہی گاڑی پہنچتی، انہیں نیچے وادی میں قائم کردہ ہسپتال پہنچا دیا جاتا۔

یہاں دو آدمیوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ ساتھ ساتھ بڑی ہوئی دو چار پائیوں پر لیٹے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ شدید زخمی تھے اور ان کے نچنے کی اُمید بہت کم تھی۔ اس کے باوجود وہ ہشاش بشاش اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ میرے جیسے کمزور دل شخص کے لیے یہ عجیب و غریب منظر تھا۔ ان میں ایک کہنے لگا: ”یار! میں تمہیں بہت جلد دوزخ میں ملوں گا“۔ اور دوسرے نے جواب دیا: ”نہیں، ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ اگر ہم مر گئے تو یہ شہید کی موت ہوگی، کیونکہ ہم نے اللہ کی راہ میں جان قربان کی ہے“۔ اسی لمحے سیکٹر کمانڈر کا بھیجا ہوا ایک ماتحت افسر آیا اور ہمیں مورچوں کی طرف لے گیا۔

میری سمجھ سے باہر ہے کہ کس طرح برف سے ڈھکی زمین پر دستی بیلچوں سے یہ مورچے بنائے گئے۔ یہ اتنے گہرے تھے کہ میرے جیسا دراز قد شخص سر اور کندھوں کو جھکائے بغیر باسانی ان میں چل پھر سکتا تھا۔ وہاں جگہ جگہ جال کے نیچے مشین گنیں نصب تھیں، جن کے بیرل عمودی پوزیشن میں تھے اور وہ اس لیے کہ دشمن کے جہاز نچلی پرواز کرتے ہوئے جو حملے کرتے تھے، ان سے ان مورچوں کو محفوظ کیا جائے۔ اس وقت یہاں بالکل خاموشی تھی، البتہ فوجی جوان تیار کھڑے تھے۔ بیش تر سپاہی آرام سے بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے یا سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔ جب کہ کچھ اپنی بندوقوں کی نالیاں صاف کرنے میں مصروف تھے یا کارتوس لگانے والی پیٹیوں کی مرمت کر رہے تھے۔ اس سیکٹر کے تمام فوجی پنجابی تھے اور ان کا تعلق جہلم اور راولپنڈی سے تھا۔ یہ اعلیٰ قسم کے انسان ہیں۔ دراز قد، دبلے پتلے، بعض چہرے مہرے یونانی دکھائی دیتے ہیں۔ فوراً مجھے یاد آیا کہ سکندر اعظم اور اس کے وارثوں کی کئی نسلیں پنجاب کے اسی علاقے میں مستقلاً اقامت پذیر رہیں۔ ممکن ہے یہ لوگ انہی سے نسلی تعلق رکھتے ہوں۔

میں تقریباً ایک گھنٹہ سیکٹر کمانڈر سے گفتگو کرتا رہا۔ وہ ایک نوجوان میجر تھا۔ میں نے اس کے ساتھ چائے پی۔ وہ اور اس کے فوجی ساتھی مجھ جیسے ایک ایسے مہمان سے مل کر بہت خوش ہوئے

جو ان کے بلند حوصلوں کا معترف تھا اور ان کے اس جذبے کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جس کے تحت وہ ملکی سرحدوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ میں نے انھیں مغربی پنجاب کے وزیر اعلیٰ [افتخار حسین ممدوٹ] اور ان کے توسط سے پاکستانی لیڈروں کی نیک خواہشات پہنچائیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں بلکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ دنیا میں پنجابی فوجیوں کا کوئی ثانی نہیں اور وہ اپنے فوجی اوصاف جن سے وہ خود مکھٹے آگاہ نہیں، کی اس قدر افزائی کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔ میں پہلی بار ان اگلے مورچوں تک آیا تھا اور یہاں کے ماحول نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے خود سے یہاں دوبارہ آنے کا وعدہ کر لیا۔

اب مجھے صحیح تاریخ کا تو علم نہیں، لیکن غالباً دسمبر ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کے اوائل میں مجھے غیر متوقع طور پر یہاں آنے کی دعوت موصول ہوئی۔ ایک روز لاہور کے سب سے بڑے کتب فروش کی دکان میں نئی مطبوعات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر میجر جنرل حمید پر پڑی۔ وہ بھی میری طرح ایسی کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ لاہور کی پیش تر نام و شخصیات کی طرح میں انھیں بھی جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے (اس وقت ان کی عمر ۴۰ سے کچھ زیادہ تھی)، لیکن وہ کشمیر کے محاذ پر ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ میں نے انھیں پوچھا کہ وہ لاہور میں کیا کر رہے ہیں؟ تو انھوں نے بتایا: ”محاذ جنگ کی گھن گرج سے دو روز کے لیے تعطیلات گزارنے یہاں آیا ہوں اور کل صبح واپس جا رہا ہوں“۔ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جو میرے لیے خاصی پرکشش تھی، لیکن میں اتنی جلدی اپنے محکمہ اخیامت اسلامیہ کے کاموں کو یک لخت چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے جواباً عرض کیا: ”ابھی نہیں، لیکن ہفتے عشرے میں ایسا ممکن ہے“۔

جنرل حمید کہنے لگے: ”ٹھیک ہے اگلے ہفتے ضرور آجائیے۔ میں روانگی سے قبل جہلم سے محاذ کشمیر تک آپ کے لیے گاڑی اور حفاظتی دستے کا انتظام کروں گا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کی آمد کے وقت میں کہاں ہوں گا۔ میں سیکرٹریوں میں کسی ایک کے نام آپ کو خط دے دوں گا اور وہ آپ کو ہر طرح کی سہولت مہیا کر دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے پسند کریں گے“۔

ایک ہفتے بعد میں جیپ میں سوار جہلم سے مشرق کی جانب جا رہا تھا، اور ڈرائیور کے ساتھ

والی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ پنجاب کی آٹھویں رجمنٹ میں دفع دار تھا۔ دوسرا فوجی پیچھے جیب کے فرش پر تختوں پر مشین گن جمائے بیٹھا تھا۔ اس سفر کے دوران ہمارا رخ پہاڑوں کی جانب نہیں تھا۔ ہماری سڑک آہستہ آہستہ دل کش مناظر سے گزرتی ہوئی کشمیر کے صوبہ پونچھ تک جاتی تھی، اور موصولہ اطلاعات کے مطابق وہاں تقریباً ایک لاکھ ہندستانی فوجی قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

پنجاب اور کشمیر کی برائے نام سرحد عبور کرتے ہی ہم پاکستانی فوج کے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ یہاں سیکڑوں خیمے نصب تھے اور پیدل فوج کی خاصی بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ یہ لشکر گاہ صوبہ پونچھ ہی کا حصہ تھی اور بھاری مشین گنیں اور چھوٹی توپیں اس کی حفاظت کے لیے لگائی تھیں۔ بظاہر ہندستانی فوج کوئی بڑا حملہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، اسی لیے یہاں کا عمومی ماحول قدرے پرسکون تھا۔ کیمپ میں فوجیوں اور اسلحہ کی نقل و حرکت میں ڈسپلن کی کمی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں میں نے پٹھان اسکواڈوں کے کچھ گروہ بھی دیکھے، جو اپنی پوشاک یعنی ڈھیلی شلوار گرتہ اور پگڑی سے بالکل الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ سینوں پر کارتوسوں سے بھری ہوئی چمڑے کی بیٹیاں، کندھوں پر لٹکی ہوئی بندوقیں اور کمر بند میں خنجر۔ ان ہتھیاروں سے لیس جان کی پروا نہ کرنے والے یہ جنگجو، اب حقیقی فوجی ضابطوں کے آہستہ آہستہ پابند ہوتے جا رہے تھے۔ (درحقیقت اس وقت پاکستان کے سرحدی محافظ یہی قبائل پٹھان تھے، جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں کے دوران میں انتہائی مؤثر کردار ادا کیا)۔

مجھے سیدھے سیکٹر کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل یعقوب خاں کے خیمے میں لے جایا گیا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ غالباً اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال ہوگی۔ انہوں نے میرا پرتپاک طریقے سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ میرے خیمے ہی میں رہیں گے۔ مجھے امید ہے آپ یہاں خوش رہیں گے۔“ یعقوب خاں ہندستان کی امیر ترین اور انتہائی اہم شمال مغربی مسلم ریاست رام پور (جو اب ہندستان میں ضم ہو چکی ہے) کے موروثی وزیراعظم کے فرزند ہیں۔ وہ بڑے مہذب، دل کش اور خوش مزاج شخص ہیں، اس لیے ہم جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ برسوں گزر جانے اور فاصلوں کے باوجود ابھی تک ہماری دوستی میں فرق نہیں آیا۔ کئی سال بعد وہ جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ پھر وہ سفیر پاکستان کی حیثیت سے واشنگٹن میں

تعیّنات ہوئے اور بالآخر صدر رضیاء الحق نے انہیں حکومت پاکستان کے وزیر خارجہ کا قلم دان سونپا۔ لیٹننٹ کرنل یعقوب خاں نے بتایا: ”میجر جنرل حمید آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں آپ کو کل صبح سویرے ان کے ہیڈ کوارٹر روانہ کر دوں گا“۔ میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا، کیونکہ اس طرح میں یہاں کے محاذ کی صورت حال کا بھی سرسری جائزہ لے لوں گا۔

رات کا کھانا سادہ، لذیذ اور پُر تکلف تھا۔ دیر تک سگریٹ نوشی اور چائے کے دور چلتے رہے۔ اس کے بعد میں سونے چلا گیا۔ اگلے روز علی الصبح میں تیار ہو گیا۔ سیکڑوں فوجیوں کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔ یعقوب خاں کے ساتھ ڈبل روٹی، نمکین پنیر اور چائے کا ناشتہ کیا اور ان سے عارضی رخصت لے کر اسی جیب پر اور انہی محافظوں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک گھنٹہ بعد وہاں پہنچے۔ اس وقت میجر جنرل حمید اپنے افسروں سمیت صوبہ پونچھ کے ایک بڑے نقشے کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے ان کی محویت دیکھ کر ذرا پیچھے ہٹنا چاہا تو انہوں نے مجھے روکتے ہوئے کہا: ”نہیں، آپ مت جائیے، آپ سے ہماری کوئی رازداری نہیں۔ درحقیقت آج میں آپ کو کچھ اور رازوں سے مطلع کروں گا“۔

اس کے بعد میجر جنرل حمید صاحب نے مجھے اپنی جیب میں بٹھا لیا اور ہم پونچھ اور ہندستان سے ملحقہ سرحدی علاقے کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر ہماری جیب شمال کی طرف چلتی رہی۔ چند کلومیٹر کے بعد مغرب کی جانب مڑ گئی اور پھر بڑے سے نصف دائرے میں ذیلی سڑکوں سے ہوتی ہوئی، دوبارہ بڑی سڑک پر آ گئی۔ پونچھ کا شہر پیچھے رہ گیا۔ اب نظروں سے بھی اوجھل ہو چکا تھا شاید اس نصف دائرے کے درمیان میں کہیں تھا۔ سڑک پر آمدورفت کم تھی۔ ادھر ادھر فوجی ٹولیوں میں سڑک کے کنارے بیٹھے وقت گزار رہے تھے۔ ایک بار مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک فوجی گاڑی ہمارے پاس سے گزری۔ دائیں جانب دُور فاصلے پر میں نے ایک گھٹنا جنگل دیکھا، لیکن وہاں بھی کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔

یہاں سے آگے بڑھے تو میجر جنرل صاحب نے میری طرف منہ پھیرا اور پوچھا: ”کیا آپ نے اس جنگل میں کوئی دل چسپ چیز دیکھی؟“ میں نے جواب دیا: ”کچھ خاص نہیں، صرف

درخت ہی تو ہیں۔“

میجر جنرل صاحب مسکرائے: ”آپ کو دیکھنا چاہیے تھا۔ اس چھوٹے سے جنگل میں پاکستان کے توپ خانے کا نصف حصہ چھپا بیٹھا ہے۔ جو سڑک پونچھ اور اس سے آگے جاتی ہے، وہ مکمل طور پر ہماری زد میں ہے اور جب ہم کل حملہ کریں گے، پونچھ میں مقیم ہندستانی فوجوں کا دونوں اطراف سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ چونکہ ہمارا توپ خانہ ان سے بدرجہا بہتر ہے، اس لیے وہ مزاحمت نہیں کر سکیں گے۔ وقت کی کمی کے باعث انھیں مکمل بھی نہیں پہنچ سکے گی۔ ہم نے اب اپنے تمام فوجی دستوں کو یہاں تعینات کر دیا ہے۔ ان حالات میں ہندستانی فوج ہتھیار ڈال دے گی یا تہس نہس ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہم سری نگر کی طرف پیش قدمی کریں گے، ان شاء اللہ۔ ہمارے لیے اب یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

میجر جنرل حمید کی اس پُر امید گفتگو میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ جوں ہی ہم واپس ہیڈ کوارٹر پہنچے، انھیں ایک شدید دھچکا محسوس ہوا۔ اسی شام افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف کے توسط سے انھیں وزیراعظم لیاقت علی خاں کا بذریعہ تار ایک خفیہ پیغام موصول ہوا کہ: ”اگلے روز حملے کا پروگرام منسوخ کر دیا جائے۔“

کئی ہفتوں بعد مجھے اصل صورت حال کا علم ہوا۔ ہندستان کی اعلیٰ فوجی کمان کو جوہی پاکستانی فوج کے اس متوقع حملے کا پتا چلا، اس نے فوراً اپنے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو تمام صورت حال اور اس کے مضر اثرات سے آگاہ کر دیا۔ پنڈت صاحب نے اسی وقت برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ اٹیلی سے فون پر رابطہ قائم کیا اور ان پر زور دیا: ”پاکستان کو ہر قیمت پر اس حملے سے روکنا ہوگا، کیونکہ اتنے مختصر وقت میں ہندستان کے لیے بذریعہ جہاز پونچھ مکمل پہنچانا ممکن نہیں ہے۔ اگر انھیں پاکستانی افواج سے ہزیمت اٹھانا پڑی تو وہ احتجاجاً دولت مشترکہ کی رکنیت چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے (کہیں اور کا اشارہ اشتراکی روس کی جانب تھا)۔ اگر پاکستان کو اپنا حملہ منسوخ کرنے پر آمادہ کر لیا جائے اور ضلع پونچھ ہندستان ہی کا حصہ رہے تو وہ یعنی پنڈت صاحب اگلے سال کشمیری عوام کو استصواب رائے کا حق دے دیں گے۔“

تمام رات نئی دہلی اور لندن کے درمیان ٹیلی فون کی تاریں بچتی رہیں۔ وزیراعظم اٹیلی کو

ہندستان جیسا بڑا ملک ہاتھ سے نکلتا دکھائی دینے لگا۔ اس نے فوراً لارڈ ماؤنٹ بیٹن (جو ۱۹۴۸ء کے آخر میں ہندستان کے گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہو کر اب انگلستان میں اپنی گذشتہ کامیابیوں پر شاداں و فرحاں زندگی گزار رہے تھے) سے مشورہ کیا اور کہا کہ برصغیر کے امور مختلفہ کے تجربہ کار ماہر کی حیثیت سے وہ نہرو کی تشویش دُور کرنے کی کوشش کریں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ چند گھنٹوں بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خاں کو فون کیا اور انھیں بتایا کہ پنڈت صاحب نے کشمیری عوام کو حق راہِ دہی کا یقین دلایا ہے اور برطانوی وزیراعظم اٹلی نے بھی اس حملے کی منسوخی کے لیے ذاتی طور پر درخواست کی ہے۔ اس وقت وزیراعظم لیاقت علی خاں سوئے تھے۔ ظفر اللہ نے انھیں جگا کر یہ پیغام پہنچایا اور انھیں اٹلی کی معروضات پر خصوصی توجہ دینے کی استدعا کی۔

اثر و رسوخ کے ان الجھیڑوں میں وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں نے جو کردار ادا کیا، اس کی تفہیم کے لیے ان کے سابقہ واقعات اور مخصوص وفاداریوں کا مختصراً تذکرہ ضروری ہے۔ وہ جماعت احمدیہ کے سرگرم رکن تھے۔ تمام مسلمان اس جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس جماعت کے بانی قادیان کے مرزا غلام احمد تھے، جو پہلے پہل ایک عالم دین کی حیثیت سے مشہور تھے، لیکن بعد میں ان کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا: وہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں اور جس کام کو حضور اکرمؐ نامکمل چھوڑ گئے ہیں، اس کی تکمیل کے لیے انھیں مبعوث کیا گیا ہے۔ یہ ایک دعویٰ ہے جس کو ہندستان کے تمام مسلمانوں نے چاہے وہ سُنی ہیں یا شیعہ، قطعاً طور پر مسترد کر دیا۔ نص قرآنی سے یہ بالکل واضح ہے کہ حضور اکرمؐ خاتم الانبیاء ہیں اور ان کے بعد کوئی پیغمبر کرہ ارض پر مبعوث نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ نبوت اسلام کے بنیادی عقیدے کی نفی ہے، اس لیے وہ اور ان کے پیروکار اسلام کی حدود سے باہر ہیں۔ ہندستان کے برطانوی حکمران، تحریک احمدیت کو بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ برسر اقتدار اسلامی یا غیر اسلامی حکومت کی اطاعت اور فرماں برداری کی سخت تاکید کر رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی حکومت کے مقتدر اصحاب، جماعت احمدیہ کے اراکین کی ہر طرح سے حمایت کرتے تھے۔ سر محمد ظفر اللہ خاں بھی ایک بااثر شخص تھے اور غلام احمد قادیانی سے

گہری عقیدت رکھتے تھے، اس لیے وہ تمام عمر انگریزوں سے زیادہ برطانیہ کے خدمت گزار رہے۔ ظفر اللہ خاں باصلاحیت وزیر خارجہ تھے اور وزیر اعظم لیاقت علی خاں بھی ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ مزید یہ کہ وہ کشمیر میں استصواب رائے کرانے کے بارے میں نہرو کے وعدہ پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ انھیں توقع تھی کہ جس مسئلے نے عرصہ دراز تک پاکستان کی توانائیوں کو ضائع کر دیا ہے، اس کا کوئی مستقل اور پائیدار حل تلاش کیا جانا چاہیے۔ یہی سوچ کر انھوں نے پاکستانی افواج کو پونچھ سے ہٹا کر بین الاقوامی سرحد پر بھجوانے کا حکم دے دیا۔ یہ خطرہ ٹلتے ہی بھارتی وزیر اعظم نہرو فوری استصواب رائے کرانے کے وعدے سے منحرف ہو گیا اور یہ مسئلہ کشمیر غیر معینہ عرصہ کے لیے معرض التوا میں ڈال دیا گیا۔

یہ اتنا بڑا قومی المیہ تھا کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ پونچھ میں ہندوستانی افواج نے خود کو مضبوط کر لیا، جب کہ پاکستان نے ایک نادر موقع کھو دیا، جو قوموں کی زندگی میں کبھی کبھار آتا ہے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خاں کا حکم نامہ پونچھ کے گرد و نواح محاذ جنگ پر تعینات پاکستانی فوجیوں پر بم بن کر گرا۔ جب انھیں علم ہوا کہ حملہ منسوخ کر دیا گیا ہے، تو وہاں موجود بہت سے افسر اور جوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کشمیر کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے اور اسے پاکستان کا حصہ بنانے کا انھوں نے جو خواب دیکھا تھا، وہ چلنا پڑ رہا ہو گیا۔ کوئی سنجیدہ شخص یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہاں مستقبل بعید میں بھی کبھی کشمیریوں کو موعودہ حق رائے دہی مل جائے گا۔

[اس صدمے کے بعد] میجر جنرل حمید نے خود کو ہیڈ کوارٹر میں بند کر لیا۔ پھر کئی مہینے تک ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے بعد وہ فوج سے مستعفی ہو گئے۔ (ماخوذ: محمد اسد، بندۂ صحرائی (خودنوشت سوانح عمری)، مرتب: پولا اسد، محمد اکرام چغتائی، ناشر: دی ٹریڈ سوسائٹی، ۲-۱-۸۱، گلبرگ III، لاہور)